قومی، جمہوری، لادینی اسٹیٹ

کیا مسلمان اس کو قبول کر سکتے ہیں؟

اس بحث کو شروع کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ عام ناظرین کی سہولت کیلیے چند اصطلاحات کی تشریح کر دی جائے۔

لفظ اسٹیٹ، جس کا مترادف ہماری زبان میں "ریاست" کا لفظ ہے، علم السیاست کی اصطلاح میں اس نظام کو کہتے ہیں جو ایک متعین رقبۂ زمین میں رہنے والی آبادی کو قاہرانہ طاقت (Coercive Power) سے ضبط میں رکھتا ہو۔ قوتِ قاہرہ کا وجود ایک طرف، اور اطاعت کا پایا جانا دوسری طرف، ان دو چیزوں کے بہم ہو جانے سے وہ نظمی ہیئت بن جاتی ہے جسے اسٹیٹ یا ریاست کہا جاتا ہے۔

اسٹیٹ کی اس تعریف کو سمجھنے کے بعد قدرتی طور پر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ وہ قوتِ قاہرہ جسکی اطاعت ایک آبادی کر رہی ہے خود اُس آبادی کے اندر اسکے مجموعہ میں سے ابھرتی ہے یا کہیں باہر سے آتی ہے؟۔ اگر اسکے اجتماعی وجود سے الگ کوئی طاقت ایسی ہے جو اس پر حاکمانہ اختیار استعمال کرتی ہے تو وہ غلام ہے۔ اور اگر وہ آبادی خود حاکمیت (Sovereignty) کی مالک ہے اور اپنی رضامندی سے ایک نظمی ہیئت کو قوتِ قاہرہ فراہم کر کے دیتی ہے تاکہ وہ اسکے معاملات کی تنظیم کرے تو وہ خود مختار جماعت ہے۔ کسی آبادی کا اس طور پر اپنے اوپر آپ حکمراں ہونا، یا بالفاظ دیگر حاکمیت سے

متمتع ہونا جمہوریت کا اصل الاصول ہے۔ جب ہم کسی اسٹیٹ کو "جمہوری اسٹیٹ" کہتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ اسٹیٹ جن باشندوں سے مرکب ہے وہی اسکی حاکمیت کے مالک ہیں۔ گورنمنٹ جو انکے اسٹیٹ کا انتظام کرتی ہے انکی اجتماعی رضامندی کی تابع ہے، اور اس کا منصب اسکے سوا کچھ نہیں ہے کہ انکی خواہشات کو وضع قوانین اور تنفیذ قوانین میں روبعمل لائے۔

جمہوری نظام کا عمل اسکے نظریہ سے بہت مختلف ہوتا ہے۔ نظری حیثیت سے تو اسٹیٹ کے ہر فرد کو حاکمیت حاصل ہے اور وہ اسکے استعمال کا حق رکھتا ہے۔ لیکن عملاً یہ ممکن نہیں ہے کہ ہر ہر شخص کی خواہش کے مطابق قوانین بنیں اور حکومت کی جائے۔ لہذا عملی اغراض کیلیے جمہوریت کا قاعدہ یہ قرار دیا گیا کہ حکومت ہمیشہ اکثریت کی خواہشات کے مطابق ہوگی یہی وہ مقام ہے جہاں سے مشکلات کا آغاز ہوتا ہے۔ جمہوری حکومت جن خوشنما نظریات سے شروع ہوتی ہے، عمل کی سرحد میں آکر وہ رخصت ہوجاتے ہیں، اور ان سب کا خلاصہ یہ نکلتا ہے کہ مملکت کے باشندوں کا ایک حصہ دوسرے حصہ کو حاکمیت سے عملاً محروم کرکے ان پر اپنی خواہشات مسلط کردے۔ ہر ملک میں مختلف گروہ مختلف قسم کے مفاد، مذاق، خواہشات اور اغراض رکھنے والے ہوتے ہیں۔ ان سب کے اشتراکِ عمل ہی سے تمدن کی مشین چلتی ہے۔ ان میں سے ہر ایک مملکت کی اجتماعی خوشحالی اور فلاح و بہبود میں کسی نہ کسی حیثیت سے اپنا حصہ ادا کرتا ہے۔ ہر ایک کیلیے اسکی اغراض اور خواہشات اتنی ہی اہمیت رکھتی ہیں جتنی دوسرے کیلیے اسکی اغراض و خواہشات۔ لیکن جمہوری نظام میں جب اکثریت کی حکومت کا اصول اختیار کیا جاتا ہے تو اسکے معنی یہ ہوتے ہیں کہ جو گروہ کثیر تعداد میں ہے وہ حاکم بن جائے اور حکومت کے زور سے اپنی اغراض اور خواہشات حاصل کرے، اور جو گروہ قلیل تعداد میں ہے وہ غلام بنالیا جائے اور اکثریت کی اغراض و خواہشات پر سے اسکی اغراض و خواہشات اسی طرح قربان کی جائیں جس طرح کسی زار یا کسی قیصر کی انتہائی ظالمانہ حکومت میں کی جاسکتی ہیں۔ یہی

چیز ہے جس کو اکثریت کا استبداد (Tyranny of the Majority) کہتے ہیں اور جو اس زمانہ کی جمہوریتوں کے چہرے پر سب سے زیادہ بدنما داغ ہے۔

اکثریت کی حکومت کا اصول صرف اُس جگہ صحیح ہو سکتا ہے جہاں کے باشندے اساسی امور (Fundamentals) میں متفق ہوں، اور اُن کے درمیان اختلاف محض آرا رکا ہو، نہ کہ اغراض کا۔ ایسی جگہ تو یہ ممکن ہے کہ آج کی اقلیت کل اکثریت بن جائے، اور آج کی اکثریت کل اقلیت بن جائے۔ رائے عام اگر محض رائے عام ہے تو وہ بدل سکتی ہے اور بدلی جا سکتی ہے۔ کل رائے عام لبرل پارٹی کی مؤید تھی تو آج وہ لیبر پارٹی کے حق میں ہموار ہو سکتی ہے۔ ایسی حالت میں کوئی اکثریت نہ مستقل اور دائمی اکثریت ہوگی، نہ کبھی ظلم و جور کا طریقہ اختیار کر سکے گی، اور نہ اقلیت کو اس سے یہ اندیشہ ہوگا کہ وہ اساسی امور پر ضرب لگائے گی۔ لیکن اغراض ـــــ یا خود غرضی ـــــ کا اختلاف، اور مذہبی اصولوں کا، یا قومی جذبات کا، یا طرز زندگی کا اختلاف وہ چیز نہیں ہے جو دلائل سے دور کیا جا سکے۔ اس اعتبار سے جو گروہ اکثریت میں ہے وہ مستقل طور پر اکثریت میں رہیگا اور جو اقلیت میں ہے وہ مستقل طور پر اقلیت میں رہیگا۔ ایسی اکثریت کو حکومت کا حق دینے کے معنی اسکے سوا کچھ نہیں کہ ایک زار کی جگہ لاکھوں زار اور ایک قیصر کی جگہ کروڑوں قیصر پیدا ہو جائیں، اور محض اس بنا پر کہ انکے سروں کی تعداد زیادہ ہے، ان کے لیے یہ جائز ہو جائے کہ اپنے ہی ہموطن لوگوں کی ایک معتدبہ جماعت پر جس طرح چاہیں ظلم و ستم کریں۔ یہ جمہوریت کے بنیادی اصولوں کی صریح اور کلی نفی ہے۔ اس چیز پر لفظ جمہوریت کا اطلاق ہی غلط ہے۔ اسے بڑے پیمانے پر چنگیزیت کہنا چاہیے۔

جن ممالک میں باشندوں کے درمیان قومی تفریق موجود ہے، یعنی مذہب، نسل، زبان، رنگ وغیرہ امور میں اختلاف پایا جاتا ہے، اور اسی طرح جہاں نظریات اور اصول زندگی کا اساسی

اختلاف ہے، یا باشندوں کے مختلف گروہوں کی اغراض باہم متصادم ہیں، وہاں مختلف عناصر کو ملا کر ایک اسٹیٹ بنانے اور اس میں جمہوریت کا اصول نافذ کر دینے کا نتیجہ ظلم کے سوا کچھ نہیں نکلا اور ہمیں دنیا کی پوری تاریخ میں ایک مثال بھی ایسی نہیں ملی جس کو مستثنیٰ قرار دیا جا سکتا ہو۔

روس میں مزدوروں کی حکومت قائم ہونے کے بعد متوسط طبقہ کے لوگ، چھوٹے زمیندار، تجارت پیشہ اور دوکاندار، اور ان سب سے زیادہ مذہبی گروہ جس بری طرح پیسے گئے اور آج بھی جس طرح وہ غلام بنا کر رکھے گئے ہیں، اس حالت کا تقابل اگر زار کی حکومت کے مظالم سے کیا جائے تو شائد زاریت ہی کو اشتراکیت کے آگے سر نیاز جھکا دینا پڑے۔ یہ اس امر کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ جہاں خود غرضی بنائے اختلاف ہو، وہاں ایک قسم کی اغراض رکھنے والوں کا حکمراں بن جانا یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ دوسرے تمام گروہوں کا خون چوس لیں اور ان کو اپنی خود غرضی کی قربانگاہ پر بھینٹ چڑھا دیں۔

چیکوسلواکیا میں اب سے ۲۰ سال قبل مختلف چھوٹی اور بڑی قوموں کو ملا کر ایک جمہوری اسٹیٹ بنایا گیا تھا۔ اس سیاسی حماقت کا جو انجام ہوا آج اسے ساری دنیا دیکھ رہی ہے ــــ سب سے بڑھکر جن دو قوموں سے توقع تھی کہ ایک قوم بن جائینگی انہی نے مصنوعی قوم سازی کے نظریہ کی دھجیاں بکھیر دیں۔ اس نئی ریاست کے اصل اجزائے ترکیبی دو ہیں۔ ایک چیک (Czechs) دوسرے سلاوک (Slovaks)۔ نسل اور قومی روایات کے لحاظ سے دونوں بالکل مختلف ہیں۔ گذشتہ ہزار برس کی تاریخ میں کہیں ان کے درمیان کسی ارتباط کا نشان نہیں ملتا۔ صرف ایک چیز ان کے درمیان مشترک تھی، اور وہ یہ تھی کہ دونوں آسٹریا ہنگری کے غلام تھے اور دونوں کو ظالم سلطنت کی نفرت اور آزادی کی خواہش نے ایک دوسرے سے قریب تر کر دیا تھا۔ سیاسی مدبرین یہ سمجھے کہ مشترک دشمن کی عداوت اور اس کے پنجہ سے آزادی حاصل کرنے کا مشترک جذبہ دو قوموں

کو ایک قوم بنا دینے کیلیے کافی بنیاد ہے۔ چنانچہ انہوں نے ان دونوں کو ملا کر ایک نئی قوم "چیکو سلاوک" وضع کر دی اور اس کو بالفعل موجود فرض کر کے ان کی ایک قومی جمہوری ریاست بھی بنا دی۔ لیکن اس جدید ریاست کی تشکیل پر کچھ زیادہ زمانہ نہ گذرا تھا کہ تجربے نے ثابت کر دیا کہ دو قوموں کو ساتھ ملا کر باندھ دینے سے ایک قوم نہیں بن جایا کرتی مصنوعی قومیت محک امتحان کی پہلی ہی رگڑ پر کھوٹی ثابت ہوئی۔ چیک کثیر التعداد تھے، زیادہ تعلیم یافتہ اور زیادہ سرمایہ دار تھے، اور آسٹریا ہنگری کے مظالم نے ان کو سلطنت کے ساتھ مذہب سے بھی متنفر کر دیا تھا۔ ان کے برعکس سلاوک لوگ سخت پابند مذہب، تعلیم میں بہت پیچھے، زیادہ تر زراعت پیشہ اور خستہ حال، اور تعداد میں بھی چیکوں کی بہ نسبت ½ - اس تفاوت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر چیک اکثریت نے دستور حکومت میں یہ طے کرا لیا کہ قومی اسٹیٹ بالکل ایک دنیوی اسٹیٹ (Secular State) ہوگا، اس میں تمام مذاہب کے ساتھ رواداری تو ضرور برتی جائیگی مگر کسی مذہب یا مذہبی نظام کو سرکاری طور پر تسلیم نہ کیا جائیگا۔ تعلیم کا پورا نظام اسٹیٹ کے ہاتھ میں ہوگا، اور "ایسی تعلیم دی جائیگی جو سائنٹفک تحقیقات کے نتائج سے متصادم نہ ہوتی ہو"[1] دستور العمل کی ان دفعات سے فائدہ اٹھا کر چیک اکثریت کی حکومت نے سلاوک علاقے کے مدارس میں لامذہب اسکول ماسٹر بھیجنے شروع کر دیے اور نظام تعلیم سے مذہبی تعلیم کو قطعی خارج کر دیا۔ سلاوک لوگوں نے اپنی مذہبی تعلیم کیلیے بطور خود کوئی انتظام کرنا چاہا تو اسے سرکاری امداد دینے سے انکار کر دیا گیا۔ حکومت کے نظم و نسق اور خصوصاً بڑے ذمہ داری کے مناصب کو چیکوں کے لیے مخصوص کر لیا گیا اور خود سلاوک علاقوں میں چیک افسر حکمراں بنکر آنے لگے۔ انہی باتوں نے آخر کار سلاوک لوگوں کو اس بات کا قائل کر دیا کہ ایک چھوٹی اور ایک بڑی قوم کو ملا کر ایک قومی جمہوری اسٹیٹ بنانا دراصل

[1] ملاحظہ ہو ۱۹۲۰ء کا چیکو سلاوک کانسٹی ٹیوشن دفعات ۱۱۹ - ۱۷۱ - ۱۲۲ - ۱۲۴

چھوٹی قوم کو بڑی قوم کی غلامی میں دینا ہے۔ چنانچہ اب وہ کئی سال سے اپنے علاقہ کیلیے حکومت خوداختیاری (Autonomous Self-government.) کا مطالبہ کر رہے ہیں[1]۔

اسی "قومی جمہوری ریاست" میں تقریباً ۳ لاکھ جرمن بھی شامل کر دیے گئے تھے، (یعنی کل آبادی کا ۱/۴ حصہ) جنکی قومیت، نسل، زبان تاریخی روایات چیک اور سلاوک دونوں قوموں سے بالکل مختلف تھیں، بلکہ صدیوں سے چیک اور جرمن نسل میں کھلی عداوت چلی آتی تھی۔ مدارس میں، کارخانوں میں، کلیساؤں میں جہاں کہیں چیک اور جرمن جمع ہوتے وہاں اکثر ہنگامے ہو جایا کرتے تھے۔ ایک دوکان میں دونوں سے یکجا کام لینا مشکل تھا حتیٰ کہ ایک اسٹیشن سے ان کا ریل پر سوار ہونا بھی دشوار تھا جسکی وجہ سے اکثر چھوٹے چھوٹے مقامات پر بھی دو اسٹیشن بنائے جاتے تھے تاکہ ایک سے چیک سوار ہوں اور دوسرے سے جرمن[2]۔ اسقدر شدید اختلافات کے باوجود ان دونوں کو ایک قومیت میں شامل کر کے ایک قومی جمہوری اسٹیٹ بنا دیا گیا جسمیں چیک اپنی اکثریت کی بنا پر حاکم اور جرمن اپنی اقلیت کی بنا پر محکوم تھی، حالانکہ صدیوں تک اسی سرزمین میں یہی جرمن حاکم اور چیک محکوم رہ چکے تھے۔ اسکا نتیجہ جو کچھ ہوا اسے ابھی حال ہی میں ساری دنیا دیکھ چکی ہے۔ ثابت ہو گیا کہ محض ایک قومی اسٹیٹ بنا دینے سے دو مختلف قومیں ایک قوم نہیں بن سکتیں اور نہ ایک جمہوری اسٹیٹ بنا دینے سے جمہوریت کی حقیقی روح پیدا ہو سکتی ہے۔ البتہ مصنوعی طور پر دو قوموں کی ایک قومیت اور ایک جمہوریت بنا دینے کا یہ اور صرف یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ کثیر التعداد قوم عملاً قلیل التعداد قوم کو غلام بنا لے اور جمہوری نظام میں اسکو حاکمیت کے فطری حقوق سے محروم کر کے رکھ دے۔ چیک اکثریت نے جرمن اقلیت کے ساتھ یہی کیا۔ تعلیم کے ذریعہ سے جرمنوں کو چیک قومیت میں جذب کرنے کی کوشش کی گئی۔ جرمن زبان و ادب کو مٹانے اور دبانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی گئی۔

[1] R. W. Seton-Watson, The New Slovakia

[2] C. D. Hazen, Europe Since 1815

سرکاری ملازمتوں میں جرمن اور چیک کا قومی امتیاز کبھی نہ بھولا گیا اور ہمیشہ چیکوں کو جرمنوں پر ترجیح دی گئی۔ تجارتی کاروبار اور سرکاری کام کے ٹھیکوں تک میں جرمنوں کو دبانے اور چیکوں کو بڑھانے کا ہر ممکن طریقہ اختیار کیا گیا۔ حتیٰ کہ خاص ان علاقوں میں بھی جہاں ۸۰ اور ۹۰ فیصدی جرمن آبادی تھی، سرکاری ضروریات کیلیے چیکوں کو ٹھیکے دیے جانے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سُڈیٹین جرمنوں کی معاشی حالت روز بروز گرنی شروع ہو گئی اور انکے کاروبار بیٹھنے لگے۔ یہ سب کچھ اُس قومی جمہوری اسٹیٹ میں ہوا جسکی "متحدہ وطنی قومیت" کا ایک جزو یہ جرمن بھی تھے، جسکے جمہوری نظام میں ان کو دستور کی رو سے پورے شہری حقوق عطا کیے گئے تھے، اور جسکی دولت مشترکہ (Commonwealth) کی ملکیت میں وہ بھی از روئے دستور یکساں حصہ دار تھے۔ لیکن ۲۰ سال کے تجربہ نے بتا دیا کہ "قومی" اور "جمہوری" کے معنی لغت میں کچھ اور ہوتے ہیں، اور حقیقت میں کچھ اور۔ آخر کار جرمنوں میں وہ عظیم الشان ہیجان رونما ہوا جو قریب تھا کہ تمام دنیا کے امن و امان کو پھونک دیتا اگر عین وقت پر عقلمندی سے کام لیکر جرمنوں کو جرمنی کے حوالہ نہ کر دیا جاتا۔

اسی قسم کے حالات ان دوسرے ممالک کے بھی ہیں جہاں مختلف قوموں کو ایک قومیت فرض کر کے ایک جمہوری اسٹیٹ میں ضم کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر یوگوسلافیا کو لیجیے۔ انیسویں صدی کے آخری دور میں آسٹریا ہنگری کے ظالمانہ تسلط سے نجات حاصل کرنے کیلیے کروٹ (Croats) اور سلافینی (Slovenes) قوموں میں آزادی کا زبردست جذبہ پیدا ہوا اور انہوں نے اپنے ہمسایہ سربیوں (Serbs) سے اتحاد کر لیا۔ ان مختلف عناصر کے درمیان آسٹریا کی عداوت اور آزادی کی مشترک خواہش کے سوا اور کوئی وجہ اتحاد نہ تھی۔ نسل میں اختلاف، مذہب میں اختلاف، زبان میں اختلاف، اور طرز زندگی میں اختلاف۔ مگر طلب آزادی کے نشے میں ان سب اختلافات کو نظر انداز کر کے یہ سب گھل مل گئے، اپنی متحدہ قومیت کا نام انہوں نے "یوگوسلافیا"

رکھ لیا، اور اپنی الگ زبانوں کے نام ملا کر ایک متحدہ قومی زبان کا عجیب و غریب نام (Serbo-Croatian Slovene) رکھا جس کا مسمیٰ کہیں دنیا میں موجود نہ تھا بلکہ تین الگ الگ زبانیں مختلف رسم الخطوں اور مختلف لسانی خصوصیات کے ساتھ موجود تھیں اور "ہندوستانی" کی طرح یہ ان کا ایک متحد نام رکھ دیا گیا تھا۔ جنگ عظیم کے دوران میں جب یہ تینوں قومیں آسٹریا ہنگری کے خلاف برسرِ پیکار ہوئیں تو جولائی ۱۹۱۷ء میں سربیا کے وزیرِ اعظم اور جوگوسلاو کمیٹی کے صدر کا ایک مشترک بیان اس مضمون کا شائع ہوا کہ:

"سرب، کروٹ اور سلافینی ایک قوم ہیں۔ آئندہ کیلئے یہ اپنا ایک قومی اسٹیٹ بنانا چاہتے ہیں جو جمہوری اسٹیٹ ہوگا۔ اس متحدہ اسٹیٹ کا جھنڈا الگ ہوگا اور تینوں شرکاء کے جھنڈے الگ الگ ہونگے جنکی حیثیت مساویانہ ہوگی۔ اسی طرح (Cyrillic) اور لیٹن دونوں رسم الخط سرکاری طور پر مساوی ہونگے، اور تینوں مذاہب یعنی آرتھوڈوکس، کیتھولک اور اسلام کا درجہ بھی مساویانہ تسلیم کیا جائیگا۔"

مگر جنگ ختم ہونے کے بعد جب آزادی ملی اور نومبر ۱۹۲۰ء میں نئی ریاست کی بنا رکھی گئی تو صورتِ حال کچھ اور ہی تھی۔ ریاست کی ایک کروڑ بیس لاکھ آبادی میں پچاس لاکھ...... کے قریب سرب تھے، تیس لاکھ کیتھولک کروٹس اور ۱۰ لاکھ سلافینی، اسکے علاوہ جرمن، مگیار، رومانی بلغاری اور البانوی بھی کئی کئی لاکھ کی تعداد میں شامل ہو گئے تھے۔ اگرچہ ان سب کو ملا کر سربی گروہ اقلیت میں تھا، لیکن الگ الگ ہر گروہ کے مقابلہ میں اسکی بڑی اکثریت تھی، اور ان اقلیتوں کے درمیان کامل اتفاق نہ ہونے کی وجہ سے اسکی پوزیشن اور زیادہ مضبوط ہو گئی تھی۔ اس پوزیشن سے فائدہ اٹھا کر سربیوں نے عملاً حاکم قوم کی حیثیت اختیار کر لی، تمام اقلیتوں کو محکوم بنا لیا، متحدہ قومیت کا تخیل ہوا میں اڑ گیا، اور حکومت کے زور سے سربی قومیت تمام قلیل التعداد جماعتوں پر مسلط

کی جانے لگی۔ تاسیس ریاست کے بعد پہلی مرتبہ جب کانسٹی ٹیوشن بنانے کیلیے نیشنل کونسل منعقد ہوئی تو سربی قوم پرستوں نے یوگوسلافی قومیت کا لبادہ اتار کر پھینک دیا اور خود مختار صوبوں کا ایک وفاق بنانے کے بجائے ایک مضبوط مرکزی طاقت رکھنے والی بادشاہی کی بنا رکھ دی جس کا فرمانروا سربیا کا بادشاہ تھا اور جس کا پایۂ تخت سربیا کا پایۂ تخت تھا۔ آج اس "قومی جمہوری حکومت" کا کھلا ہوا مسلک یہ ہے کہ اقلیتوں کی قومیت کے ایک ایک نشان کو مٹائے، اور تمام اقلیتیں تقریباً ۱۲ سال سے پیہم کوشش کر رہی ہیں کہ اس پھندے سے، جسکو خود انہوں نے خوشی خوشی پہنا تھا، کسی طرح بچ نکلیں[1]۔

ان چھوٹی ریاستوں کو چھوڑ کر ان بڑے ممالک کو لیجیے جو آج جمہوریت اور دستوریت کے ابوالآبا سمجھے جاتے ہیں۔ ان میں بھی جہاں کہیں مختلف مذاہب یا مختلف نسلی قومیتوں کو ملا کر ایک قومیت بنی ہے، جبر اور ظلم ہی سے بنی ہے اور قومی جمہوری اسٹیٹ وہاں اسی طرح بنا ہے کہ آبادی کے ایک کثیر التعداد اور منظم گروہ نے چھوٹے گروہوں پر زبردستی اپنی خواہشات اور اپنے اصولوں کو مسلط کیا اور ان کے امتیازی وجود کو مٹا کر رکھ دیا۔

سوئس قوم اور اسکی جمہوری وفاقی ریاست کس طرح بنی؟ ابتداءً یہ ۲۲ آزاد جمہوری ریاستوں کا محض ایک تحالف (Confederation) تھا۔ انیسویں صدی کی ابتدا میں مذہبی آزاد خیالی کے اثرات سوئٹزرلینڈ پہنچے اور مذہب کو تعلیم اور سیاست دونوں سے خارج کرنے کا ارادہ کیا گیا۔ سات کیتھولک ریاستوں نے اسکی مخالفت کی۔ ۱۵ آزاد خیال ریاستوں نے اُن پر زبردستی

[1] تفصیلات کیلیے حسب ذیل کتابیں ملاحظہ ہوں:-

C. D. Hazen, Europe since 1815

A. H. Morley, The New Democratic Constitution of Europe

Encyclopædia Britannica, Article: Yugoslavia

اپنے خیالات کو مسلط کرنا چاہا جس کا انہیں از روئے آئین کوئی حق نہ تھا۔ آخر ۱۸۴۷ء میں ساتوں کیتھولک ریاستیں تحالف سے الگ ہوگئیں اور تحالف کے اصول کی رو سے وہ پوری طرح اس کی مجاز تھیں۔ مگر آزاد خیال ریاستوں نے اپنی غالب اکثریت سے ان کے اس فعل کو ناجائز ٹھیرایا اور ان کے علاقوں پر حملہ کرکے انہیں زبردستی ایک وفاقی اسٹیٹ میں شامل ہونے پر مجبور کردیا۔ پھر ۱۸۴۸ء میں جو بنیادی دستور بنایا گیا اس میں وفاقی ریاستوں کے اختیارات محدود کرکے مرکز کے اختیارات نہایت وسیع کردیے گئے تاکہ اکثریت پوری طرح اقلیت پر اپنی مرضی اور اپنے اصولوں کو نافذ کر سکے اور اقلیت مجبور ہوکر اس واحد قومیت میں اپنے آپ کو گم کردے جسے آزاد خیال لوگ (Radicals) وجود میں لانا چاہتے تھے۔[1]

برطانیہ میں کیا ہوا؟ انیسویں صدی کے ثلث اول تک برطانیہ عظمیٰ میں انتخاب کا قانون اس قسم کا تھا کہ انگلینڈ کو اسکاٹ لینڈ، ویلز اور آئرلینڈ، تینوں کی مجموعی طاقت سے قریب قریب تین گنی زیادہ اکثریت پارلیمنٹ میں حاصل ہوتی تھی۔ انگلستان کی صرف ایک کاؤنٹی (کارنوال) کے نمائندے پورے اسکاٹ لینڈ کے نمائندوں کے برابر تھے حالانکہ اسکاٹ لینڈ کی آبادی کارنوال سے آٹھ گنی تھی۔ کوئی کیتھولک، کوئی یہودی اور کوئی ایسا شخص جو انیگلیکن چرچ کو نہ مانتا ہو، از روئے قانون نہ تو پارلیمنٹ کا ممبر بن سکتا تھا، نہ کسی سرکاری عہدے پر مامور ہوسکتا تھا اور نہ کسی میونسپلٹی میں داخل ہوسکتا تھا۔ ان سب فرقوں کو چرچ آف انگلینڈ کیلیے عشر دینا پڑتا تھا۔ نکاح کیلیے چرچ آف انگلینڈ کے پادری کے پاس جانا ہوتا تھا۔ اپنی عبادت گاہ کو چرچ آف انگلینڈ میں رجسٹر کرانا پڑتا تھا۔ آکسفورڈ اور کیمبرج میں داخلہ کیلیے ایسی مذہبی شرائط رکھی گئی تھیں جنہیں انیگلیکن چرچ کے پیرووں کے سوا کوئی پورا نہ کرسکتا تھا، اسلیے ان دونوں

[1] Cambridge Modern History, vol. XI.

یونیورسٹیوں کے دروازے گویا دوسرے فرقوں کیلیے بند تھے۔ چرچ آف انگلینڈ کو نہ ماننے والے لوگ ووٹ دینے کے حق دار تو تھے مگر وہ اپنے ہم مذہب لوگوں کو ووٹ نہ دے سکتے تھے کیونکہ انہیں پارلیمنٹ میں داخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔ ۱۸۲۸ء میں ان قیود کو اُٹھانے اور نرم کرنے کا میلان پیدا ہوا اور قریب قریب ۶۰ برس کی مسلسل اور تدریجی اصلاح نے بالآخران کو بالکلیہ منسوخ کیا۔ اس قسم کی تھی وہ جابرانہ طاقت، اور اس قسم کا تھا وہ مادّی و اخلاقی غلبہ جس سے انگلینڈ کے لوگوں نے برطانیہ عظمیٰ کی مختلف قوموں اور مختلف مذہبی جماعتوں کو مغلوب کر کے اپنی تہذیب اور اپنی قومیت میں جذب کیا، اور وہ واحد قومیت بنائی جسے آج "ایک ملک اور ایک قوم" کا نعرہ بلند کرنے والے سب سے پہلے مثال میں پیش کیا کرتے ہیں۔ شائد کہ ان کے پیش نظر بھی ایک قوم بنانے کے ایسے ہی طریقے ہونگے۔

یہاں مثالوں کا استقصاء مقصود نہیں ہے۔ اگرچہ عہد حاضر کی تاریخ اور خود ہمارے موجودہ دور کے واقعات سے ایسی ہی بکثرت مثالیں اور بھی پیش کی جاسکتی ہیں۔ مگر جو بات میں ثابت کرنا چاہتا ہوں اسکے لیے یہی مثالیں بہت کافی ہیں۔ ان سے بآسانی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مختلف قوموں کو ایک قوم قرار دیکر ایک جمہوری اسٹیٹ بنانے کے معنی کیا ہیں، اور یہ بات جو بظاہر نہایت معصوم الفاظ میں بیان کی جاتی ہے اس میں کسقدر غیر معصوم مقصد پوشیدہ ہوتا ہے۔

اب ذرا ہندوستان کے حالات پر ایک نظر ڈالیے اور دیکھیے کہ یہاں ایک قومی، جمہوری، لادینی اسٹیٹ بنانے کے معنی کیا ہو سکتے ہیں۔

جمہوری اسٹیٹ کے معنی یہ ہیں کہ تمام باشندگان ہند کو اسٹیٹ میں حاکمیت حاصل ہو۔ مگر عملاً اس حاکمیت کو وہ جماعت استعمال کرے جو اکثریت میں ہو۔

جمہوری کیساتھ "قومی" کی قید لگانے سے یہ نتیجہ نکلا کہ یہاں مختلف قومیتوں کے وجود کی نفی

کردی جائے اور تمام باشندوں کو ایک قوم قرار دیا جائے۔ دوسرے الفاظ میں اسکے معنی یہ ہوئے کہ ہندوستان کی حکومت میں کسی شخص کا حصہ اس حیثیت سے نہ ہوگا کہ وہ ہندو یا مسلمان ہے بلکہ صرف اس حیثیت سے ہوگا کہ وہ ہندوستانی ہے۔ اس کا ایسے اسٹیٹ کی رکنیت میں شامل ہونا خود بخود اس امر کو مستلزم ہوگا کہ وہ اپنے ہندو یا مسلمان ہونے کی حیثیت کی خود نفی کردے۔ اس کی جداگانہ قومی حیثیت خواہ بالفعل برقرار رہے، مگر وہ اس حیثیت میں اسٹیٹ سے کسی چیز کا مطالبہ نہ کرسکے گا، بلکہ اسے ان فیصلوں کو قبول کرنا ہوگا جو مجموعی طور پر ملک کے باشندوں کی اکثریت ملک کی مجالس قانون ساز میں طے کردے۔

لادینی کی قید اس میں ایک اور چیز کا اضافہ کرتی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ کوئی شخص اور کوئی گروہ کسی مذہب کا پیرو ہونے کی حیثیت سے اسٹیٹ میں حصہ دار نہیں ہے۔ وہ اسٹیٹ کے دائرے میں اپنی اس حیثیت کو لے کر بھی نہیں آسکتا۔ اس دائرے میں اسکو خود اپنی اس حیثیت کی نفی کرنی ہوگی۔ اخلاق، تمدن، معاشرت، معیشت، تعلیم، اور زندگی کے دوسرے مسائل کے متعلق اسکے اپنے نظریات خواہ کچھ ہوں، وہ ان سب کو اس وقت بھلا دینے پر مجبور ہوگا جب باشندوں کی اکثریت ان مسائل میں کوئی دوسرا نظریہ اختیار کریگی۔ وہ اس وقت یہ نہ کہہ سکیگا کہ میرے مذہب اور میری تہذیب کا نظریہ دوسرا ہے اور میں اکثریت کے نظریہ کو قبول نہیں کرسکتا۔ اگر وہ ایسا کہے گا تو اسکو جواب دیا جائیگا کہ اسٹیٹ میں جناب کا حصہ اس حیثیت سے ہے ہی کہاں کہ آپ فلاں مذہب اور فلاں تہذیب کے پیرو ہیں۔ مجلس قانون ساز میں آپ ایک مذہبی آدمی کی حیثیت سے آئے کب ہیں کہ آپ کو اس قسم کی عذرات پیش کرنیکا حق حاصل ہو۔ یہاں تو آپکی حیثیت محض ہندوستانی ہونیکی ہے، اور جمہوریت کا اصول آپ تسلیم کرچکے ہیں، لہذا ہندوستانیوں کی اکثریت جو نظریہ رکھتی ہے اسے طوعاً و کرہاً آپکو قبول ہی کرنا ہوگا۔ اس پر مزید یہ کہ اگر وہ اپنے گروہ کی حد تک اپنی مذہبی تنظیم کرنیکے لیے حکومت کے وسائل و ذرائع میں سے کوئی حصہ مانگیگا تو اس سے کہدیا جائیگا کہ جناب یہ کوئی مذہبی اسٹیٹ نہیں ہے، ایک دنیوی لادینی اسٹیٹ ہے۔ اسکی حاکمیت میں جب آپکا کوئی حصہ مذہبی آدمی ہونے کی حیثیت سے

ہے ہی نہیں تو آپ کو مذہبی تنظیم کیلیے حکومت کے اختیارات اور وسائل و ذرائع میں سے کوئی حصہ کیسے مل سکتا ہے۔ آپ کو یہ کام کرنا ہے تو جایئے، خود اپنے مذہبی گروہ کے وسائل سے کیجیے۔

یہ نتائج تو محض ان تین اصطلاحوں کے معانی پر غور کرنے سے حاصل ہوتے ہیں۔ اب عملی حیثیت سے دیکھیے تو یہ تصویر اور زیادہ خوفناک ہو جاتی ہے۔ اوپر میں بیان کر چکا ہوں کہ جمہوری نظام کے صحیح یا غلط ہونے کا تمام تر انحصار اس سوال پر ہے کہ اس میں اکثریت اور اقلیت کس طرح بنتی ہے۔ اگر باشندوں کے درمیان زندگی کے بنیادی مسائل (Fundamentals) میں اتفاق ہے، اور صرف وسائل و طریقہ ہائے کار (Means and Methods) میں اختلاف آرا پایا جاتا ہے، تب تو اکثریت اقلیت میں اور اقلیت اکثریت میں تبدیل ہوتی رہے گی نہ کوئی اکثریت مستقل اور دائمی ہوگی نہ اقلیت۔ ایسی حالت میں اس امر کا کوئی خطرہ نہیں کہ اکثریت ظلم و استبداد کا طریقہ اختیار کرے اور اقلیت کو حاکمیت سے محروم کر کے ایک غلام اور محکوم قوم بنا لے۔ لیکن اگر صورت حال برعکس ہو۔ اگر باشندوں کے درمیان زندگی کے اساسی امور میں اختلاف ہو، اور اس اختلاف نے ان کو الگ الگ ممتاز گروہوں میں تقسیم کر دیا ہو، اور ان گروہوں میں ترجیح ہم جنس کی اسپرٹ پائی جاتی ہو، اور اس گروہ بندی نے ان کی دنیوی اغراض کو بھی بڑی حد تک ایک دوسرے سے متصادم کر دیا ہو، تو ایسی جگہ اکثریت دائمی اکثریت ہوگی اور اقلیت دائمی اقلیت ہوگی۔ وہاں رائے عام کو ہموار کر کے اقلیت کا اکثریت بن جانا غیر ممکن ہے۔ وہاں سب باشندوں کو ایک قوم قرار دینے اور اس بنیاد پر جمہوری لادینی اسٹیٹ بنانے کے معنی اس کے سوا کچھ نہیں ہیں کہ اکثریت کو اقلیت پر ظلم کرنے اور اس کو غلام بنا کر رکھنے اور اسکو تباہ و برباد کرنے کا لائسنس دیا جائے۔ وہاں قومی اسٹیٹ دراصل اکثریت کی قوم کا اسٹیٹ ہوگا، اور لادینی اسٹیٹ صرف اقلیت کیلیے لادینی ہوگا۔ اس میں اکثریت کو نہیں بلکہ صرف اقلیت کو اپنی جداگانہ

قومی حیثیت اور اپنی مذہبیت کی نفی کرنی ہوگی۔ اکثریت اپنی ان سب حیثیتوں کو برقرار رکھ کر سب کچھ کر سکے گی، مگر اقلیت اپنے مذہب کا یا اپنی تہذیب یا زبان و ادب یا فلسفۂ حیات کا نام نہ لے سکیگی۔ ایسی جگہ تمام باشندوں کو ایک قوم قرار دینے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ فی الواقع ایک قوم ہیں، بلکہ اسکے معنی دراصل یہ ہیں کہ جو قوم کثیر التعداد ہے وہ جمہوری اسٹیٹ کی تمام طاقتوں پر قابض ہو کر قلیل التعداد جماعتوں کی قومیتوں کو مٹانا اور اپنی قومیت میں جذب کر کے ایک قوم بنانا چاہتی ہے۔

آنکھیں کھول کر انصاف کی نظر سے دیکھیے۔ کیا ہندوستان میں فی الواقع یہی صورت حال موجود نہیں ہے؟

(۱) ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ یہاں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان قومیت کا اختلاف اس اختلاف سے بھی زیادہ نمایاں پایا جاتا ہے جو یورپ میں جرمن اور فرنچ اور انگریز اور اطالوی قوموں کے درمیان ہے۔ وہاں کم از کم اخلاقی شعور ایک سا ہے، تہذیب کے بنیادی اصول ایک ہیں، اور آداب و اطوار اور طرز زندگی میں بھی اساسی اختلاف موجود نہیں ہیں، یا اگر ہیں بھی تو بہت خفیف مگر یہاں آٹھ نو سو برس تک ایک آب و ہوا اور ایک خطۂ زمین میں پہلو بہ پہلو رہنے کے باوجود دونوں قوموں کی زندگی کے دھارے الگ الگ بہ رہے ہیں۔ پنڈت جواہر لال دیہاتی ہندوؤں اور مسلمانوں کو کچھ ایک جیسے لباس پہنتے دیکھ کر اور معیشت کے میدان میں ایک ساتھ محنت مزدوری کرتے دیکھ کر حکم لگا سکتے ہیں کہ یہ ایک قوم ہیں۔ وہ ہندوستان میں پیدا تو بے شک ہوئے ہیں مگر ان کا دماغ انگلستان میں بنا ہے اور اس پر روسی وارنش تازہ تازہ چڑھا ہے، اسلیے وہ رات دن ہندوستانیوں میں رہ کر بھی ان کو صرف اوپر سے اور باہر سے ہی دیکھ سکتے ہیں جسطرح کوئی امریکن سیاح دیکھ لیتا ہے۔ وہ انکے دل میں اتر کر اور انکی زندگی میں گھس کر نہیں دیکھ سکتے کہ ان

کے درمیان کتنا بڑا اور گہرا تفاوت ہے۔ دونوں قوموں کے جذبات و احساسات ایک دوسرے سے اسقدر مختلف بلکہ باہم متصادم ہیں کہ ہندو جس چیز کو الہٰی تقدیس و احترام کی نظر سے دیکھتا ہے، مسلمان اسکو شوق سے کھاتا ہے، اور یہ فرق مہاتما گاندھی اور مولانا ابوالکلام سے لیکر چھوٹے سے چھوٹے گاؤں کے جُلاہے اور پاسی تک کے درمیان یکساں ہے، بلکہ مہاتما اور مولانا تو اس باب میں مدارات سے بھی کام لے سکتے ہیں لیکن گاؤں والے اس پر لٹھ چلا بیٹھتے ہیں۔ شہری ہندو اور مسلمان تو کبھی کبھار ایک میز پر کھا بھی لیتے ہیں، مگر دیہاتی ہندو تو مسلمان کا ہاتھ لگا ہوا پانی تک نہیں پیتا۔ وہ ریل میں بھی اُس تختہ پر جہاں مسلمان کھانا کھا رہا ہو، بادلِ ناخواستہ ہی بیٹھتا ہے اور دل میں چھی چھی کرتا رہتا ہے۔ ان دونوں کی زندگی کے اندر داخل ہونے والے دروازے ایک دوسرے کیلیے بالکل بند ہیں۔ پیدائش سے لیکر موت تک ہر رسم، ہر تہوار، ہر خوشی اور غمی میں ہندو ہندو کے ساتھ ہوتا ہے اور مسلمان مسلمان کے ساتھ۔ ان بین اختلافات کے ہوتے کون انہیں ایک کہہ سکتا ہے

(۲) منڈی اور دفتر اور کارخانے میں یہ دونوں یکجا تو ضرور ہوتے ہیں، مگر کیا ان کے قومی اختلاف کا اثر انکے معاشی مفاد اور کاروباری اغراض میں ظاہر نہیں ہوتا؟ تخیل کی بلندیوں پر پہنچ کر کہنے والا جو چاہے کہدے اور لکھنے والا جو چاہے لکھ دے۔ مگر روزمرہ کے کاروبار میں جو کچھ ہو رہا ہے اسے کاروباری زندگی کے اندر اتر کر دیکھیے اور جو لوگ یہاں کام کر رہے ہیں ان سے پوچھیے۔ کیا آدمی کو ملازم رکھنے میں اور مزدور سے خدمت لینے میں اور دوسرے چھوٹے اور بڑے معاملات میں ہندو اور مسلمان کی تمیز نہیں کی جاتی؟ کیا دیہاتی آبادیوں تک میں مسلمانوں کا تمدنی اور اقتصادی بائیکاٹ نہیں ہو رہا ہے؟ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ جو پیشے مسلمانوں کے ہاتھ میں تھے انکے لیے ہندو تیار کیے جاتے ہیں تاکہ مسلمانوں سے کام نہ لینا پڑے؟ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ آڑھت کے کاروبار میں مسلمان کا گھسنا قریب قریب ناممکن کر دیا گیا ہے، اور اگر کوئی مسلمان آڑھتیہ منڈی میں آتا ہے

تو پوری ہندو برادری اس کا دیوالہ نکلوانے کیلیے متحد ہو جاتی ہے ؟ پھر کیا ابھی حال ہی میں سارے ہندوستان نے یہ نہیں دیکھا کہ پنجاب کے جدید زرعی قوانین پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے معاشی مفاد صریحاً ایک دوسرے کی ضد نکلے ؟ سود خواروں کے غاصبانہ تسلط سے زمینداروں کا نکلنا مسلمانوں کے نزدیک رحمت تھا تو ہندو کے نزدیک لعنت ، اور اس تقسیم میں ہندو اور مسلمان اس طرح ایک دوسرے کے مقابل آکر کھڑے ہوئے کہ بہت سے کانگریسی خیال کے مسلمان مسلمانوں کے ساتھ تھے اور قریب قریب تمام کانگریسی ہندو ـــــ بھولا بھائی دیسائی تک ـــــ ہندوؤں کے ساتھ - کیا یہ اس امر کا صریح ثبوت نہیں ہے کہ معاشی معاملات میں بھی دونوں قوموں کی اغراض بڑی حد تک متصادم ہیں ؟

(۳) پھر کیا سیاسی معاملات میں یہ لوگ قومی امتیاز اور ترجیح ہم جنس کا طریقہ برتنے سے بچے ہوئے ہیں ؟ بے شمار مثالوں کو چھوڑ کر میں صرف کانگریس کے حدود عمل سے چند کھلی ہوئی مثالیں پیش کرتا ہوں ، اس لیے کہ یہی جماعت ہندوستانی قومیت کی مدعی ہے ، اور اسلیے بھی کہ اسکے دائرے میں جو قومی امتیاز پایا جاتا ہے اس کا الزام برطانوی سامراج کے سر تھوپنے کی جرأت شائد پنڈت جواہر لال بھی نہیں کر سکتے -

۱ - بہار اسمبلی میں ۲۹ اپریل ۳۸ء کو خود کانگریسی حکومت نے سوال نمبر ۲۶۹ کا جواب دیتے ہوئے اعتراف کیا کہ صوبہ بہار کی ۲۴ میونسپل کمیٹیوں میں مخلوط انتخاب کے ذریعہ سے ۲۹۹ نشستوں میں سے ۱۴۷ نشستیں مسلمانوں کو ملیں اور ۱۵۲ ہندوؤں کو ، درانحالیکہ تناسب آبادی کے لحاظ سے کم از کم ۱۹۳ نشستیں مسلمانوں کو ملنی چاہیے تھیں ، کیونکہ ان میونسپلیٹوں کے حدود میں مسلمانوں کی آبادی تقریباً ۳۳ فی صدی ہے - یہ تو انتخابی نشستوں کا حال تھا - خود اس کانگریسی حکومت نے نامزدگی سے جو نشستیں پُر کیں ان کے متعلق خود اسکا اپنا اعتراف ہے کہ ۷۵ میں سے ۶۱ غیر مسلموں کو اور صرف ۱۴ مسلمانوں کو دی گئیں ، حالانکہ تناسب آبادی کے لحاظ سے ۲۵ نشستیں مسلمانوں کو ملنی چاہیے تھیں

(ملاحظہ ہو سوال نمبر ۲۰۷ کا جواب - مورخہ ۲۹ راپریل ۳۸ء)

۲- سی پی کے ضلع بلڈانہ میں تعلقہ بورڈ کے ۲۰۷ حلقے ہیں اور ان میں سے کسی ایک حلقہ میں بھی مخلوط انتخاب کے ذریعہ سے کوئی مسلمان منتخب نہ ہوسکا۔ (ملاحظہ ہو قاضی سید محمود علی صاحب ملکاپوری کا خط مہاتما گاندھی کے نام - جو ۲۵ ستمبر ۳۸ء کے اخبار مدینہ میں شائع ہوا ہے)۔

۳- سی پی میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ارکان کا جو انتخاب ہوا اس میں مخلوط انتخاب کی وجہ سے ایک مسلمان بھی منتخب نہ ہوسکا اور نہ کسی اچھوت پر کانگریسی ہندوؤں کی نظر انتخاب پڑسکی (ملاحظہ ہو سی پی کے کانگریسی مسلمانوں کا شکایت نامہ - مدینہ ۲۰ رجولائی ۳۸ء)

۴- اسی صوبۂ متوسط میں ایک درجن سے زیادہ میونسپل کمیٹیاں ایسی ہیں جن میں ایک مسلمان بھی مخلوط انتخاب کی وجہ سے منتخب نہیں ہوا۔ یہی حال اکثر لوکل اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کا ہے کہ وہ منتخب شدہ مسلمان نمائندوں سے بالکل خالی ہیں۔ (ملاحظہ ہو مسٹر تاج الدین کا مراسلہ - اسٹار آف انڈیا مورخہ ۲ رجولائی ۳۸ء - نیز یہ خیال رہے کہ صاحب مراسلہ صوبہ متوسط کے مشہور نیشنلسٹ مسلمان ہیں)

۵- خود کانگریس ہائی کمانڈ انتخاب کے معاملہ میں جو ذہنیت رکھتی ہے اس کا حال کانگریسی صوبوں کی وزارتوں پر ایک نظر ڈالنے ہی سے کھل جاتا ہے۔ جن صوبوں میں ہندو اکثریت ہے، وہاں ہندو وزیر اعظم ہیں اور جہاں مسلمان اکثریت ہے وہاں مسلمان کو وزیر اعظم منتخب کیا گیا ہے۔ ہندو اکثریت کے کسی صوبہ میں کوئی کٹے سے کٹا وطن پرست بھی اسلامی نام سے موسوم ہونے اور اسلامی سوسائٹی کے تعلق سے متہم ہونے کی بدولت وزارتِ عظمیٰ پر بار نہ پاسکا۔ حتیٰ کہ بیچارے ڈاکٹر سید محمود بھی اس شرف سے محروم رہے حالانکہ اگر ان کا نام محمود کے بجائے سنہا ہوتا تو یقیناً انکی وطن پرستانہ خدمات ایسی تھیں کہ وہی وزیر اعظم بنائے جاتے۔ اسکے بعد وزیروں اور پارلیمنٹری سکرٹریوں کی فہرست

اٹھاکر دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ زیادہ تر اسی تناسب آبادی کا لحاظ کیا گیا ہے جسکے متعلق کہا جاتا ہے کہ صرف فرقہ پرست ہی اس کو ملحوظ رکھتے ہیں - بلکہ بعض جگہ تو تناسب آبادی سے بھی کم مسلمان لیے گئے ہیں۔

کیا یہ کھلی ہوئی علامات اس امر کی نہیں ہیں کہ سیاسیات کے دائرے میں بھی خود متحدہ قومیت کے علمبرداروں کے ہاں قومی امتیاز اور ترجیح ہم جنس کی اسپرٹ پوری طرح موجود ہے؟ ایسی حالت میں واحد قومیت کے اصول پر جمہوری اسٹیٹ بنانے کے معنی اس کے سوا کیا ہو سکتے ہیں کہ جہاں مسلمان کثیر التعداد ہوں وہاں وہ ہندوؤں کو، اور جہاں ہندو کثیر التعداد ہوں وہاں وہ مسلمانوں کو اسٹیٹ کے کاروبار سے بے دخل کردیں، اور چونکہ مجموعی طور پر ہندوؤں کی اکثریت ہے اسلیے وہ قومی اسٹیٹ کو ہندو قوم کا اسٹیٹ بنانے میں کامیاب ہو جائیں -

(۴) متحدہ قومیت کے اس سراسر جھوٹے دعوے پر جو قومی، جمہوری لادینی اسٹیٹ بنایا جائیگا وہ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں مسلمانوں کیلیے تو بلاشبہ غیر مسلم اسٹیٹ ہوگا، مگر ہندوؤں کے لیے لازم نہیں کہ وہ غیر ہندو اسٹیٹ ہو، بلکہ اپنی اکثریت کے بل پر وہ اسکو ایک ہندو اسٹیٹ بنا سکتے ہیں، اور واقعات سے روز بروز عیاں ہوتا جارہا ہے کہ وہ ایسا ہی کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اسکے لیے بھی میں صرف ایک صوبہ کے چند واقعات بطور نمونہ پیش کرونگا :-

۱- سی پی کی کانگریسی حکومت کے تحت تعلقہ بورڈ چاندور کا ہندو چیرمین ۲۴ ستمبر ۳۸ء کو تمام مدارس کے نام سرکلر (نمبر ۴۴۶) جاری کرتا ہے جس میں حکم دیا جاتا ہے کہ ۲ اکتوبر کو مہاتما گاندھی کی سالگرہ کے دن بچے اور استاد سب مل کر ان کی تصویر کی پوجا کریں۔ یہ سرکلر بلا امتیاز ہندو و مسلم سب مدارس کو سرکاری طور پر بھیجا جاتا ہے اور اس پر کوئی باز پرس نہیں ہوتی -

۲- اسی صوبہ کی کانگریسی حکومت محکمۂ پولیس کے حکام کو (جن میں ہندو اور مسلمان سب شامل ہیں) ہدایت نامہ بھیجتی ہے کہ جس جلسہ یا تقریب میں "بندے ماترم" کا گیت گایا جائے اور وہ وہاں موجود ہوں

تو انہیں بھی عام حاضرین کے ساتھ قیام تعظیمی کرنا چاہیے۔ اس واقعہ کو خود وزیر اعظم نے اپنے ایک پریس نوٹ میں تسلیم کیا ہے۔ (ٹائمز آف انڈیا مورخہ ۲۸ جون ۳۸ء)

۳۔ ساگر (صوبہ متوسط) کی میونسپل کمیٹی کا صدر، مسلمان طلبہ کو تنبیہ کرتا ہے کہ اگر وہ بندے ماترم گانے میں شریک ہونگے تو انہیں مدرسے سے نکال دیا جائیگا۔ اس واقعہ کو بھی خود سی پی کے وزیر اعظم نے مذکورۂ بالا پریس نوٹ میں تسلیم کیا ہے۔

۴۔ اسی صوبہ کے ایک سرکاری مدرسے میں انجمن ترقی اردو کے نمائندے نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ مسلمان بچے ہندو بچوں کے ساتھ مل کر سرسوتی کی پوجا کر رہے تھے، اور ان کو سلام کرنے کے بجائے ہاتھ جوڑ کر "جے رام جی کی" کہنا سکھایا گیا تھا (ملاحظہ ہو مولوی عبدالحق صاحب سکرٹری انجمن ترقی اردو کا خط گاندھی جی کے نام۔ اخبار "پیام" مورخہ یکم ستمبر ۳۸ء)

۵۔ خود کانگریس کانسٹی ٹیوشن میں برار کو اس کا مشہور و معروف نام چھوڑ کر "ودربھا" اور صوبہ متوسط کو "مہاکوشل" سے موسوم کیا گیا ہے۔ گویا کہ اب رامائن کا عہد ہندوستان میں واپس آرہا ہے۔

۶۔ مسٹر شریف، وزیر صوبہ متوسط کا واقعہ ابھی سب کے حافظہ میں موجود ہے۔ انہوں نے ایک ایسے مسلمان کو رہا کر دیا تھا جسے ایک ہندو لڑکی کے ساتھ زنا کرنے کے الزام میں عدالت سے سزا ہوئی تھی۔ اس جرم کی پاداش میں کانگریس ہائی کمانڈ نے انکو وزارت سے معزول کر دیا۔ مگر فسادات جبل پور کے سلسلہ میں جو ہندو ملزمین ۱۲ مسلمانوں کے قتل کے الزام میں ماخوذ تھے ان کو سی پی کی ہندو وزارت نے حکماً رہا کر دیا اور اس پر ڈسپلن کے ان دیوتاؤں کو جن سے ہائی کمانڈ مرکب ہے، کسی بازپرس کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ حال ہی میں ہوشنگ آباد کے ایک ہندو (بابو سنگھ) کو جسے ایک جوان لڑکی کو زہر دے کر مار ڈالنے کی پاداش میں ہائی کورٹ سے سزائے موت کا حکم ہوا تھا

سی پی کے ہندو وزیر مسٹر ڈی کے مہتا نے رہا کر دیا اور اس پر بھی ہائی کمانڈ کو کسی تحقیقات اور کسی تادیبی کارروائی کا خیال نہ آیا۔

۷۔ اسی صوبہ میں محض اکثریت کے زور پر ودیا مندر اسکیم نافذ کی جا رہی ہے اور مسلمانوں کی متفقہ مخالفت کا استخفاف کرنے میں گاندھی اور شکلا اور ہائی کمانڈ سب متفق ہیں۔

ان واقعات کے علاوہ بہار، یوپی مدراس اور سی پی میں قربانی گاؤ کو حکماً بند کرنے، اور ہندی کو "ہندوستانی" کے پُر فریب نام کی آڑ میں بزور رائج کرنے، اور زبان سے عربی و فارسی کے زبان زد عام الفاظ کو نکال کر نئے غیر مانوس الفاظ گھڑنے، اور سرکاری ملازمتوں میں کھلم کھلا امتیاز برتنے کے واقعات اس قدر کثیر ہیں کہ ان سب کو یہاں نقل کرنا موجب تطویل ہوگا۔ جو کچھ ہمیں ثابت کرنا تھا اسکے لیے مذکورۂ بالا شواہد کافی ہیں۔

اب ہر شخص خود دیکھکر فیصلہ کر سکتا ہے کہ جس "جنگ آزادی" کی منزل مقصود مسلمانوں کے قومی مفاد بلکہ انکی قومی ہستی ہی سے منافات کی نسبت رکھتی ہو اس میں کوئی مسلمان کس طرح حصہ لے سکتا ہے۔ مسلمانوں کو آخر اتنا بے وقوف کیوں فرض کیا گیا ہے کہ وہ اس نوعیت کے اسٹیٹ کو خود اپنے سر پر مسلط کرنے کے لیے جنگ کرینگے؟ کہیں وہ لوگ خود ہی تو عقل باختہ و ہوش ربودہ نہیں ہو گئے ہیں جو ایک قوم سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ جانتے بوجھتے اپنی قبر آپ کھودنے میں جانفشانی دکھائیگی؟